

صدارتی امیدواران؟؟

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے نہایت سنجیدہ انگریزی میں کسی نے پوچھا کہ کیا آپ ڈاکٹر صفدر محمود ہیں جس نے پاکستان پر کچھ کتابیں بھی لکھی ہیں؟ میں نے ہاں میں جواب دیا اور ساتھ ہی کہا کہ کتابیں لکھنا تو اب ماضی کی یاد بن کر رہ گیا ہے۔ آپ فرمائیے کیسے یاد کیا؟ اس شخص نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ انگلستان کے ایک بڑے اخبار میں کام کرنے والا صحافی تھا اور پاکستان کے صدارتی امیدواروں پر ”سنو ری“ لکھ رہا تھا اور اسی حوالے سے وہ پاکستان کے مختلف کھسار یوں کے تجربے حاصل کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔

گفتگو کے آغاز میں اس نے پوچھا کہ تمہارے خیال میں پاکستان کے صدارتی انتخاب میں کون سا امیدوار آئیڈیل ہے۔ میرا جواب تھا کہ تینوں امیدواروں میں سے کوئی بھی نہایت موزوں امیدوار نہیں اور میں اسے پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے نیک شگون نہیں سمجھتا لیکن میں خلوص نیت سے سمجھتا ہوں کہ ایک طویل عرصے کے بعد ہماری اسمبلیاں آئین کے مطابق کسی غیر فوجی شخصیت کو صدر منتخب کرنے جاری ہیں اس لئے جسے بھی اسمبلیاں منتخب کریں اسے کھلے دل سے تسلیم کر لینا چاہئے اور اسے پوری قومی حمایت حاصل ہوتی چاہئے۔ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے پوچھا کہ تمہارے ذہن میں بہترین صدر کا تصور کیا ہے؟ میں نے جواباً عرض کیا کہ صدر کی اہلیت کی شرائط ہمارے آئین میں موجود ہیں لیکن یہ کہ صدر کیسا ہوا اور کہاں سے ہو اس کا انحصار ملکی سیاسی صورتحال پر ہوتا ہے۔ مثلاً موجودہ تناظر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے ملک کو ایک پختہ جمہوری ذہن کی ایسی شخصیت کی ضرورت ہے جس کا دامن الزامات سے صاف ہو، اس کی بزرگی اور قد و قامت کا پورے ملک میں احترام کیا جاتا ہو اور ترجیحاً اس کا تعلق بلوچستان سے ہو کیونکہ آبادی کے لحاظ سے اس چھوٹے اور رقبے کے لحاظ سے اس بڑے صوبے میں شدید احساس محرومی پایا جاتا ہے۔ ہمارے سابق فوجی صدر کی غیر سیاسی اور ”بے بسیرت“ پالیسیوں کے سبب وہاں علیحدگی کی تحریکیں پنپ رہی ہیں جن میں ہمارے دشمن ملک بھی اپنا حصہ ڈال رہے ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ بلوچستان کو قومی دھارے میں لانے کے لئے صدر کا انتخاب اسی صوبے سے ہونا چاہئے تھا لیکن اب تو بہر حال اس کا وقت گزر چکا۔ سیاسی جماعتوں کی اپنی ترجیحات اور اپنی اپنی حکمت عملی تھی جن کے نتیجے کے طور پر تین امیدوار انتخابی اکھاڑے میں موجود ہیں۔

اس نے فوراً القہہ دیتے ہوئے کہا کہ تمہارے خیال میں کیا زرداری صاحب اس خلا کو پر کر سکیں گے؟ میں نے وضاحت کرتے ہوئے عرض کیا کہ زرداری صاحب قید و بند اور جلا وطنی کی بھٹی میں سے گزر کر خاصے پختہ ڈیوکر بیٹ ہو چکے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اول تو ان کا دامن الزامات سے صاف نہیں۔ آپ دنیا بھر کے کسی بھی تفتیشی ویب سائٹ پر جائیں تو آپ کو زرداری صاحب کی جائیدادوں اور کرپشن کی تفصیلات ملیں گی۔

ہو سکتا ہے کہ ان میں کچھ مبالغہ بھی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ان کا یہی ایجنڈا بن چکا ہے۔ یہ کہنا کہ یہ بین الاقوامی اداروں کی ویب سائٹس کی سازش کا حصہ ہیں، طفلانہ بات ہوگی کیونکہ ان ویب سائٹس کے محققین نے بڑی محنت سے اور ثبوتوں کے ساتھ مواد اکٹھا کیا ہے۔ اول تو ایسے شخص کا سربراہ مملکت بننا جس کا بین الاقوامی ایجنڈا مشکوک اور الزامات سے آلودہ ہو، خود اس ملک کے حق میں اچھا شگون نہیں ہوتا کیونکہ یہ خود اس ملک کے ایجنڈا کو متاثر کرتا ہے۔ یوں تو زرداری صاحب پیپلز پارٹی کے عملی سربراہ ہیں اور ان کی جماعت ایک وفاقی سیاسی پارٹی ہے اس لئے ان کا یہ حق ہے لیکن اگر پی پی پی ہی بلوچستان سے کسی معزز شخصیت کو صدارتی امیدوار کے طور پر نامزد کرتی تو اس سے پی پی پی کی سادھ میں اضافہ ہوتا لیکن ان کی اپنی جمہوریاں تھیں اور زرداری صاحب کی اپنی ضروریات تھیں جن کے تحت وہ ایوان صدر میں جلوہ افروز ہونا چاہتے تھے۔ اس لئے اب تو ان کے لئے دعائی کی جاسکتی ہے کیونکہ بظاہر وہ یہ بازی جیتتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس نے موضوع بدلتے ہوئے چبھتا ہوا سوال پوچھا۔ سوال یہ تھا کہ میاں نواز شریف نے جنس سعید ایوان صدر صدارتی امیدوار نامزد کرتے ہوئے انہیں سونے میں تولنے کی خواہش ظاہر کی تھی تمہارے خیال میں ایسا کیوں تھا؟ میں نے مسکراتے ہوئے عرض کیا صدارتی صاحب بھاری بھر کم شخصیت ہیں۔ انہیں سونے میں تولنا میاں صاحب کو بہت مہنگا پڑتا کچھ ایسا ہی معاملہ مشاہد حسین کا بھی ہے جنہوں نے چوہدری برادران کی دعوتیں اڑاتے اڑاتے اپنا وزن خاصا بڑھا لیا ہے۔ اس لحاظ سے زرداری صاحب سب سے زیادہ موزوں امیدوار ہیں کیونکہ اول تو ”زر“ ان کے نام کا حصہ ہے دوم وہ جسمانی طور پر فٹ، سمارٹ اور کم وزن ہیں اور سوم وہ میاں صاحب کے منہ بولے بھائی ہیں۔ اس نے میری بات سن کر قہقہہ لگا لگا اور کہنے لگا کہ آپ میرے سوال کا جواب ٹال رہے ہیں۔ میرے سوال کا جواب دیجئے۔

میں نے عرض کیا کہ میاں صاحب نے اپنے صدارتی امیدوار کو سونے میں تولنے کی حسرت کا اظہار اس لئے کیا تھا کہ اول تو جنس صدارتی صاحب نے میاں صاحب کی گردن چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے پیچھے سے چھڑائی تھی ورنہ شاہ صاحب کے ارادے بلند تھے اور وہ وزیر اعظم کی عدالت میں حاضری اور معذرت کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس لئے میاں صاحب صدارتی صاحب کے زیر احسان ہیں اور اب وہ اس احسان کا بدلہ چکا رہے ہیں جیسے زرداری صاحب نے بے شمار سفیران ایٹ لارج، مشیران اور عہدیداران مقرر کر کے لوگوں کے احسانات کا بدلہ اتارنا شروع کیا ہے۔ یہ الگ بات کہ بہت سے حضرات ابھی تک قطار میں کھڑے ہوئے ہیں اور خوشامدی جھکنڈوں سے زرداری صاحب کی توجہ حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔ صدارتی صاحب کو سونے میں تولنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ انہوں نے صدر شرف کے پی پی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر کے آئین کی بالادستی کی خاطر اپنا عہدہ قربان کر دیا تھا جو بہر حال بہت بڑا کارنامہ تھا۔ آج کل میاں صاحب نے عدلیہ کی آزادی کا بیڑہ اٹھایا ہوا ہے اس لئے امید کرنی چاہئے کہ جو جج حضرات فاروق نائیک کی پرکشش دعوت کو ٹھکرا کر حلف لینے سے انکاری ہیں میاں صاحب ان کو بھی سونے میں تولیں گے لیکن اگر سونے میں تولنا ممکن نہ ہو تو کم از کم انہیں چاندی میں ضرور تولا جائے۔

وہ صحافی صاحب مسکرائے اور کہنے لگے کہ میرا آخری سوال یہ ہے کہ جب مسلم لیگ (ق) کو اپنی شکست کا یقین تھا تو انہوں نے مشاہد حسین کو بطور صدارتی امیدوار کیوں نامزد کیا؟ میں نے جھنجکتے جھنجکتے کہا کہ شاہ صاحب میرے دوست ہیں اور میری ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔ لیکن اس جوانی میں صدر بننا ان کے لئے مناسب نہیں کیونکہ اس کے بعد وہ کیا کریں گے؟ وہ جسٹس رفیق تارڑ کی مانند مسجد میں بیٹھ کر اللہ کر سکتے ہیں نہ کڑا کے نکالنے سے باز آ سکتے ہیں۔ چوہدری صاحب نے ان کو اس لئے نامزد کیا تاکہ وہ زندگی میں ایک بار شکست کا مزہ چکھیں ورنہ تو ہمیشہ کامیابی کے جھنڈے ہی گاڑتے رہے ہیں۔ مشاہد حسین نے یہ نامزدگی اس لئے قبول کی کہ چلنے اس سے ان کی ”ٹوہر“ بنے گی، قد کاٹھ ایوان صدر کے برابر ہو جائے گا اور تاریخ میں صدارتی امیدواروں کی فہرست میں نام شامل ہو جائے گا۔ کیا یہ کل کلاں لائبریری نکل آئے لیکن چوہدری صاحب دور کی مار پر تھے۔ اگر وہ صدارتی امیدوار کھڑا نہ کرتے تو ان کی پارٹی کے رہے سبے اراکین مسلم لیگ ن اور پی پی پی میں تقسیم ہو جاتے۔ یہ سب صدارتی امیدوار کی دین ہے کہ آج مسلم لیگ (ن) کے قائدین اپنی اصولی سیاست پر لات مار کر ان سے مذاکرات کر رہے ہیں اور دوسری طرف وزیراعظم گیلانی ان سے ووٹ مانگ رہے ہیں۔

اس طرح آمریت کی علامت اور نشانی مسلم لیگ (ق) ایک بار پھر ”معزز“ بن گئی ہے۔ چوہدری صاحب یہی چاہتے تھے۔ ان کی خواہش پوری ہو گئی۔ لیکن اس کا فائدہ زرداری صاحب کو ہوا اگر مسلم لیگ (ق) اپنا امیدوار نامزد نہ کرتی تو آئین کے مطابق زرداری صاحب کو کامیابی کے لئے کم از کم نصف ووٹوں کی ضرورت ہوتی۔ اب انہیں محض اکثریت کی ضرورت ہے جو مقابلہ آسان اور کھل ہے۔ میں نے بات ختم کی تو مجھے محسوس ہوا کہ صحافی صاحب کی تسلی ہو چکی ہے۔ انہوں نے بڑے بھرپور انداز سے میرا شکریہ ادا کیا اور آئندہ بھی زحمت دینے کی خوشخبری سنا کر فون بند کر دیا لیکن میں ابھی تک سوچ رہا ہوں کہ کیا میں نے اس کے سوالات کے جوابات ٹھیک دیئے؟



Print This Post



Email This Post

Posted in [Columns](#), [Dr. Safdar Mehmood](#) [No Comments »](#)

Siassi Tesaadam Kab..

September 4th, 2008

La60r Ka

100% Satisfaction - Low Price La60r ka
Shipped Worldwide

Hair Transplant Pakistan

Dr. Muhammad Nasir Rashid Hair Transplant &
Hair Loss Therapy

سیاسی اقتصاد کب اور کیوں ہوتا ہے؟

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

سوال یہ ہے کہ پارلیمنٹ اور صدر کے درمیان اقتصاد کب اور کیوں ہوتا ہے؟ یہ سوال اس لئے اہم ہے کیونکہ ہمارے ملک میں کتنی ہی قانون ساز اسمبلیاں اس اقتصاد کی بحیثیت چڑھ چکی ہیں، جبکہ ہندوستان میں صرف وزیراعظم کی سفارش پر اسمبلیاں منسوخ کی جاتی رہی ہیں اور اس منسوخی کا مقصد نئے انتخابات کروانا ہوتا تھا۔ اس سوال کا جواب سمجھنے کے لئے آپ کو ایک تاریخی کہانی سنانا چاہتا ہوں جس کے پس منظر سے ہماری اکثریت آگاہ نہیں۔ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی 10 اگست 1947ء کو معرض وجود میں آئی تھی اور ملک چلانے کے لئے 1935ء کے آل انڈیا ایکٹ کو ضروری ترجیحات کے ساتھ عبوری آئین کے طور پر نافذ کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں دستور ساز اسمبلی ایک وقت قانون ساز اسمبلی بھی ہوتی تھی اور سادہ اکثریت سے دستور میں ترمیم کرنے کی مجاز تھی۔ عبوری آئین انگریزوں کا دیا گیا ریاستی ڈھانچہ تھا، اس لئے اس میں گورنر جنرل کو وزیراعظم اور کابینہ کو دس کرنے کا اختیار بھی موجود تھا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے اسی اختیار کا سہارا لے کر اپریل 1953ء میں خواجہ ناظم الدین کی کابینہ کو فارغ کیا جس کے بعد اراکین اسمبلی میں ایک خوف سا پیدا ہوا اور وہ لاہنگ کرنے لگے کہ گورنر جنرل کو اس اختیار سے محروم کر دیا جائے کیونکہ اس سے پارلیمانی نظام کی لٹی ہوئی ہے۔

گورنر جنرل دارالحکومت سے باہر تھا کہ بیس ستمبر 1954ء کو دستور ساز اسمبلی نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعات 10، 10.9، 10 الف 10 ب اور 12 کو ایک منسوخ کر دیا۔ ان دفعات کے تحت گورنر جنرل کو کابینہ توڑنے اور وزیراعظم کو گھر بھجوانے کا اختیار حاصل تھا۔ گورنر جنرل کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کارروائی غلط میں کی گئی۔ وہ یوں کہ دستور ساز اسمبلی کے ایک پرائیویٹ رکن جناب ہاشم گزدر نے آئین میں ترمیم کا بل پیش کیا جسے تقریباً دس پندرہ منٹوں میں منظور کر لیا گیا اور اسی دن اسے گزٹ آف پاکستان میں شائع کر دیا گیا۔ گورنر جنرل غلام محمد کو اختیارات کا چمکا پڑ چکا تھا، یعنی شیر کے منہ کو خون لگ چکا تھا، اس لئے اسے محض آئینی سربراہ بنا قبول نہ تھا۔ وہ دارالحکومت پہنچا۔ اس نے ممتاز دولتانہ اور کھوڑو کے خلاف نااہلی کی کارروائی (بیروڈا) واپس لے کر انہیں اپنے ساتھ ملایا اور اپنی سیاسی پوزیشن مضبوط کرنے کے بعد چوبیس اکتوبر 1954ء کو ملک میں ہنگامی حالت (ایمرجنسی) کا اعلان کر دیا۔ مرکزی وزارت یعنی کابینہ توڑ دی اور ساتھ ہی دستور ساز اسمبلی کو بھی منسوخ کر دیا، حالانکہ اسمبلی اس سے یہ اختیار واپس لے چکی تھی۔ اس کے بعد عدالتی کارروائی کی داستان طویل ہے لیکن یہ تو آپ کو علم ہے کہ غلام محمد کے اسی ایکشن کے نطن سے نظریہ ضرورت نے جنم لیا جس کا طوق آج تک ہماری قوم کی گردن میں پڑا ہوا ہے۔

ماضی کے تجربات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور پارلیمانی نظام کی روح کے پیش نظر 1973ء کے آئین میں صدر مملکت کو محض آئینی سربراہ بنادیا گیا تھا، یعنی صدر کے پاس پارلیمنٹ کی بساط پہنچنے اور کابینہ کو فارغ کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ ضیاء الحق نے غیر جماعتی انتخابات کروانے کے بعد قومی اسمبلی سے سووے بازی کر کے آٹھویں ترمیم منظور کرائی جس میں صدر کو اسمبلی اور کابینہ منسوخ کرنے کا اختیار مل گیا۔ او جزی کمپ کے حادثے کی انکوائری اور کئی دیگر معاملات پر رنجیدگی کے سبب صدر ضیاء الحق نے اسی اختیار (B(58(2) کی تلوار سے جو نوجو حکومت اور قومی اسمبلی کو ختم کر دیا۔ صدر ضیاء الحق کے بعد غلام اسحاق صدر بنے تو انہوں نے باری باری محترمہ بینظیر بھٹو اور نواز شریف کی حکومتوں کو منسوخ کیا۔ عام طور پر صدر غلام اسحاق خان کے اس اقدام کی وجہ ذاتی رنجیدگی اور حکومت کے کچھ ایسے فیصلے تھے جو صدر کو قابل قبول نہیں تھے، چنانچہ بحیثیت سپریم کمانڈر آرمی چیف کے ساتھ سمجھوتہ کر کے حکومتوں اور عوام کی منتخب کردہ اسمبلیوں کو گھر بھجواتے رہے۔ صدر غلام اسحاق خان مسند اقتدار سے رخصت ہونے تو محترمہ نے بڑی محنت کر کے فاروق بھٹائی یعنی محترمہ فاروق لغاری صاحب کو صدر منتخب کروایا تاکہ وہ بلا خوف و خطر حکومت چلا سکے اور اسے ایوان صدارت سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ ہو، لیکن فاروق لغاری صاحب نے ذاتی رنجشوں کی بنا پر کرپشن کے الزامات لگا کر اپنی منہ بولی بہن محترمہ بینظیر بھٹو کی حکومت کو فارغ کر دیا۔ اسمبلی توڑ دی اور نئے انتخابات کروادیے۔ ان انتخابات کے وقت لوگ سیاسی بے یقینی اور حکومتوں کی بار بار رخصتی سے تنگ آ چکے تھے۔ میاں نواز شریف نے سیاسی استحکام کے منشور کے تحت عوام سے دو تہائی اکثریت کا مطالبہ کیا اور بیوی مینڈیٹ لے کر وزیراعظم بن گئے۔ اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے آئینی ترمیم کر کے صدر مملکت کو (B(58(2) کے اختیار سے محروم کر دیا اور صحیح معنوں میں پارلیمنٹ کی بالادستی قائم کر دی۔ اس دوران ہونے والے چاروں انتخابات کے منصفانہ ہونے پر شک و شبہ کا اظہار کیا جاتا ہے، کیونکہ اسٹیبلشمنٹ (صدر + فوج + عدلیہ) کا جھکاؤ جس طرف ہوتا تھا اظہار وہی پارٹی سرخرو ہوتی تھی۔ غلام اسحاق خان تو باری باری کے اصول کے قائل تھے لیکن مکافات عمل کے اصول کے تحت اپنی ہی سازشوں کا شکار ہو گئے، اگر صدر مملکت اس قدر پاور فُل نہ ہوتا تو شاید انتخابات پر بھی شکوک کے چھینٹے نہ پڑتے۔ اس ساری صورتحال کی جڑ گورنر جنرل یا صدر مملکت کا وہ اختیار تھا جس کے تحت اسے اسمبلی توڑنے اور حکومت منسوخ کرنے کا اختیار حاصل تھا اور جسے جنرل ضیاء الحق نے اپنے پسندیدہ تجزیہ نگاروں اور دانشوروں کے ذریعے سفینی والو کا نام دیا تھا۔

سفینی والو کا فلسفہ اس دلیل کی بنیاد پر تعمیر کیا گیا تھا کہ اس اختیار کے ذریعے فوجی مداخلت کا راستہ روکا جاسکتا ہے جو کہ بہر حال مستحکم خیزبات تھی کیونکہ میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ جب فوج ایک اور کا فیصلہ کر لے تو پھر صدارتی اختیارات اس کا راستہ نہیں روک سکتے۔ ویسے بھی B(58(2) کا آرمی ٹیک اور سے کیا تعلق؟ ہم نے اپنی تاریخ میں بار بار یہ دیکھا کہ جب صدر کے پاس یہ اختیار تھا تو ذاتی رنجشوں کی بنیاد پر قومی اسمبلیاں اور حکومتیں توڑی جاتی رہیں جس کا خدیا زہ ملک و قوم کو بھگتنا پڑا۔ یہ ایک طے شدہ اصول ہے کہ جب بھی پارلیمانی نظام میں سربراہ حکومت کے پاس حکومت توڑنے کے اختیارات ہوں گے تو صدر اور وزیراعظم میں ٹکراؤ ضرور ہوگا۔ اسی لئے علم سیاست کا یہ ایک اصول ہے کہ وہ فقیہ تو ایک بستر میں سو سکتے ہیں لیکن دو بادشاہ نہیں۔ جب وزیراعظم اور صدر دونوں طاقتور ہوں گے تو اقتصاد ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اسی لئے پارلیمانی نظام میں صدر محض آئینی سربراہ ہوتا ہے۔ یہ خلوص نیت سے محسوس کرتا ہوں کہ اگر ہمیں آئندہ اقتصاد سے بچنا ہے اور ملک میں سیاسی استحکام کا خواب شرمندہ تعبیر کرنا ہے تو ہمیں 1973ء کا آئین اپنی اصلی شکل میں بحال کرنا پڑے گا۔



Print This Post



Email This Post

Posted in [Columns](#), [Dr. Safdar Mehmood](#) [No Comments »](#)

Aur Ab Taqet Wer Seder Ka...

September 3rd, 2008

سے اس امکان کو نال دیا جبکہ ہمارے سیاسی قائدین اس فہم و فراست اور بصیرت کا مظاہرہ نہ کر سکے۔

اگرچہ یہ مستقبل کا معاملہ ہے لیکن ماحول کچھ اس قسم کا پیدا کیا جا رہا ہے جیسے زرداری صاحب صدر منتخب ہونے کے بعد آئین کو اپنی اصل شکل میں بحال نہیں ہونے دیں گے اور نہ ہی اپنے صدارتی اختیارات سے تائب ہوں گے اگرچہ حکومت پر بھی ان کی اپنی ہی پارٹی قابض ہے جس کے خلاف انہیں اختیارات استعمال کرنے کی ضرورت نہیں لیکن سیاست کا کیا اعتبار کیونکہ سیاست اپنے رنگ بدلتی ہی رہتی ہے۔ میاں نواز شریف کے ساتھ کئے گئے معاہدوں اور 2 نومبر کی عدلیہ کی بحالی سے انحراف کے بعد اگر زرداری صاحب نے صدر منتخب ہونے کے بعد آئین کو 1973ء کی شکل میں لانے کا وعدہ بھی پورا نہ کیا تو یہ ایک سانحہ ہوگا جس سے حکمرانوں اور سیاستدانوں کی مقبولیت کو شدید دھچکا لگے گا اور عوام کے اعتماد کو گہری پٹھیں پھینگی۔

مختصر یہ کہ ایک طویل عرصے کی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد پاکستان میں جمہوریت کا سورج طلوع ہوا ہے۔ آٹے کی کمیابی، لوڈ شیڈنگ، مہنگائی اور غربت کے تاریک دور میں لوگوں کے سامنے صرف ایک ہی امید کی شمع رہ جاتی ہے اور وہ ہیں قومی سیاستدان خدا کے لئے اس شمع کو روشن رہنے دیجئے اور عوام سے کئے گئے وعدے پورے کیجئے۔



Print This Post



Email This Post

Posted in **Columns, Dr. Safdar Mehmood** No Comments »

Ye Dollor Kahan Se Aye?

September 1st, 2008

یہ ڈالر کہاں سے آئے؟

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

میں نے ابھی چائے کا پیالہ پکڑا ہی تھا کہ کسی دور دراز مقام سے غنی چوہدری صاحب کا فون آیا۔ کہنے لگے کہ 16 کروڑ عوام میں سے کسی کو اللہ نے توفیق نہیں دی کہ وہ حکمرانوں سے پوچھتا کہ حضور والا! یہ جو سوئزر لینڈ حکومت نے 6 کروڑ ڈالر یعنی پانچ ارب روپے کے منجھداٹھے بحال کئے ہیں یہ 6 کروڑ ڈالر کہاں سے آئے؟ کیا یہ آسمان سے گرے ہیں؟ اگر آسمان سے اس طرح ڈالر گرتے ہیں تو ہم بھی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ پاکستان پر ڈالروں کی بارش کرے کیونکہ ملک کا غیر ملکی زرمبادلہ بہت کم ہو گیا ہے۔ میں نے جھپکتے ہوئے ان سے عرض کیا کہ بیچاری قوم کو انعام نہ دیں۔ قوم بھوک، مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ سے اس قدر بزدل حال ہو چکی ہے کہ اسے حکمرانوں کے ڈالروں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس لحاظ سے یہ حرام کی کمائی کو حلال کرنے کا بہترین وقت ہے۔ عوام کو اس سے بھی غرض نہیں کہ کس نے ملک کو کتنا لوٹا ہے اور کس کے بیرون وطن کتنے ارب یا کھرب کے اٹاٹھے ہیں۔ لوگ صرف اپنے روزمرہ کے مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں اور زندہ رہنے کے وسائل مانگتے ہیں کیونکہ انہیں یقین ہے کہ پاکستان لٹتا ہی رہا ہے اور آئندہ بھی لٹتا ہی رہے گا۔ چوہدری صاحب نے جھنجھلا کر پوچھا ”تو تمہاری رائے کیا ہے؟“ میں نے عرض کیا کہ چوہدری صاحب میں اسے سوئزر لینڈ کی حکومت کی جانب سے زرداری صاحب کے صدارت کے کاغذات منظور ہونے کی ”پبلی سلائی“ سمجھتا ہوں۔ آپ ذرا دیکھتے رہیں کہ آگے آگے کیا ہوتا ہے۔ چوہدری صاحب بعد تھکے میں اپنے بیان کی وضاحت کروں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ چوہدری صاحب اپنی بات منوائے بغیر نہیں لیں گے تو میں نے جان چھڑانے کے لئے کہا کہ چوہدری صاحب! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ رقم زرداری صاحب اور بی بی شہید کے سوئزر لینڈ والے اکاؤنٹ میں آئی تھی۔ ان چھ کروڑ ڈالروں کے علاوہ چھتیس (36) لاکھ ڈالر کمیشن کی رقم کا بھی معاملہ زیر تفتیش تھا۔ اس کیس میں 2003ء میں زرداری صاحب کو سزا بھی ہوئی تھی جس کے خلاف انہوں نے اپیل کر دی تھی۔ ابھی تفتیش جاری تھی کہ این آرا دیا گیا اور حکومت پاکستان کے انارنی جنرل نے سوئزر لینڈ کی حکومت کو لکھ دیا کہ مقدمہ ختم کر دیا جائے اور اس حوالے سے منجھدی گئی رقم آصف علی زرداری صاحب کو واپس دے دی جائے۔ چوہدری صاحب میری بات سنتے رہے اور بولے کہ یہ خط کس نے لکھا تھا؟ میں نے جواباً عرض کیا کہ یہ خط سابق انارنی جنرل ملک قیوم نے لکھا تھا جواب استعمال ہونے کے بعد مستغنی ہو چکا۔ وہ یہ خط لکھنے کی بجائے مستغنی ہو جاتے تو کسی حد تک اپنا بھرم قائم رکھتے میں کامیاب ہو جاتے کیونکہ انہوں نے بطور جج لاہور ہائی کورٹ زرداری صاحب کو سزا بھی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ بعد ازاں جب ان کی سیف الرضن عرف احتساب الرضن سے گفتگو کی ٹیپ منظر عام پر آئی تھی تو انہیں استغنی دینا پڑا تھا۔ چوہدری صاحب میری بات سن کر ”ہاں ہوں“ کرتے رہے اور پھر بولے لیکن زرداری صاحب کے پاس یہ رقم آئی کہاں سے؟“ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمانے لگے کہ یہ مقدمہ اس دور کا ہے جب محترمہ بینظیر بھٹو وزیراعظم تھیں اور زرداری صاحب وزیر سرما یہ کاری تھے۔ میں نے ان کی بات کاٹے عرض کیا کہ حضور! مجھے کیا علم کہ یہ رقم کہاں سے آئی ہے۔ براہ کرم آپ ان سے براہ راست پوچھیں۔ آخر سید شاہد حسین بھی تو ان سے یہی پوچھ رہے ہیں لیکن زرداری صاحب ان کے سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں کیونکہ وہ دن رات انتہائی مہم میں مصروف ہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے تجویز کیا کہ چوہدری صاحب آپ یہ سوال انہی دنوں ان سے پوچھ لیں کیونکہ صدر بننے کے بعد وہ ہر قسم کے سوال و جواب سے بالاتر ہو جائیں گے اور دنیا کی کوئی عدالت ان سے پوچھ گچھ نہیں کر سکے گی۔ یوں بھی وزیراعظم سے لے کر پتیکر تک ان کے ہوں گے اور حکومت ان کی منہی میں بند ہوگی۔ اس لئے آپ کو صدارتی حلق سے پہلے پہلے ان سے جو پوچھنا ہے پوچھ لیں..... چوہدری صاحب نے لمبی سانس لی اور موضوع بدلتے ہوئے کہنے لگے لیکن ڈاکٹر صاحب! آج کی خبر کے مطابق تو سوئزر لینڈ کے منجھدے نے کہا ہے کہ اس مقدمہ کو بند نہیں کیا جانا چاہئے تھا اور اس نے پراسیکیوٹر کے اس تاثر کو بھی رد کر دیا ہے کہ فائل میں تفتیش کے لئے مواد نہیں تھا۔ سوئس جج کا کہنا ہے کہ ریکارڈ میں زرداری صاحب کے خلاف شواہد موجود تھے لیکن حکومت پاکستان کے کہنے پر مقدمہ ختم کر دیا گیا۔

میں نے ان کی بات سنی ان کی سنی کرتے ہوئے جواب دیا کہ چوہدری صاحب میں سوئس جج کا بیان پڑھ چکا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کسی زمانے میں اس حوالے سے نیپ کے پاس ناقابل تردید شواہد تھے اور یہی وجہ ہے کہ حکومت پاکستان اس مقدمے میں پارٹی بنی تھی۔ حکومت پاکستان کا دعویٰ تھا کہ یہ رقم ملک سے لوٹ کر وہاں پہنچائی گئی ہے اسی لئے اسے حکومت پاکستان کو واپس لوٹایا جائے۔ اسی لئے سوئزر لینڈ حکومت نے اس رقم کو منجھد کر دیا تھا۔ اب کیا صورتحال ہے خدایا بہتر جانتا ہے؟ چوہدری صاحب نے ایک بار پھر لمبی سر آدھ بھری اور سوال کیا ”لیکن وہ چھتیس لاکھ (36) ڈالر کمیشن کی رقم کا کیا ہوا؟“ میں نے جواب دیا کہ حضور والا! چونکہ اس رقم کا کوئی وارث یعنی دعویٰ دائر نہیں تھا اس لئے وہ رقم سوئزر لینڈ کی حکومت نے بحسن و کرا ضبط کر لی ہے۔ چوہدری صاحب نے تبصرہ فرماتے ہوئے کہا کہ کمیشن کی رقم بھی زرداری صاحب کی ہی تھی جو انہیں کوئینا ایس جی ایس کمپنی نے دی تھی لیکن وہ کمیشن کی رقم کو کلیم کر کے اپنے آپ کو بے نقاب نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وقتی خاموشی ہو اور بعد ازاں اس رقم کو بھی کلیم کر لیا جائے کیونکہ شروع شروع میں زرداری صاحب نے انگلستان میں 356 ایکڑوں پر پھیلے ہوئے سرے محل کی ملکیت سے بھی انکار کر دیا تھا لیکن بعد ازاں اس کی ملکیت کا دعویٰ کر کے قبضہ حاصل کر لیا..... چوہدری صاحب کی گفتگو جاری تھی کہ میں نے ذیل دیتے ہوئے عرض کیا کہ حضور والا! میں ان معاملات پر کیا تبصرہ کروں؟ میں تو آپ کی باتیں سن کر سہا ہوا ہوں۔ وہ ایک دم بولے ”کیوں؟“ میں نے خلاصی حاصل کرتے ہوئے عرض کیا کہ چوہدری صاحب! آپ نے اخبار میں پڑھا ہوگا کہ رجن ملک نے وزارت داخلہ میں زرداری صاحب پر اعتراضات کا جواب دینے اور ان کی ایجنڈنگ کے لئے ایک خصوصی سیل قائم کر دیا ہے حالانکہ یہ کام وزارت اطلاعات کا ہے۔ چوہدری صاحب نے بیزارگی کے انداز میں ”ہوں“ کہا۔ میں نے جان کی امان چاہتے ہوئے عرض کیا کہ چوہدری صاحب! مجھے کیوں مروا تے ہو اب رجن ملک کا یہ سیل ہمارا بھی وہی حشر کرے گا جو وہ نام نہاد بدہشت گردوں کا باجوڑ وغیرہ میں کر رہا ہے۔ نہ جانے کیوں میرا یہ کہنا تھا کہ چوہدری صاحب نے اللہ حافظ کہے بغیر فوٹو فون کو بند کر دیا۔ شاید وہ بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئے تھے۔ ویسے بات بھی کچھ ایسی ہی ہے۔



Print This Post



Email This Post

Posted in Columns, Dr. Safdar MehmoodNo Comments »

Aik Aur Khawab Toot...

August 29th, 2008

ایک اور خواب ٹوٹ گیا

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

اب تو یوں لگتا ہے جیسے بہت سے لوگوں کی مانند میں بھی آئیڈیلزم اور حسن ظن کا مریض ہوں اور حسین خواب دیکھتا رہتا ہوں اور اپنے قارئین کو بھی دکھاتا رہتا ہوں جبکہ حقائق کی دنیا بڑی سنگدل، اقتدار کے تقاضے بڑے ظالم اور عملی سیاست کی ضروریات نہایت خود غرض ہوتی ہیں۔ چنانچہ انہی زمینی حقائق کی چٹانوں سے ٹکرا کر ہمارے خواب ٹوٹتے رہتے ہیں اور ماضی میں بھی اس طرح ٹوٹتے رہے ہیں کہ مجھے اپنی قومی زندگی کے ساتھ برس محض خوابوں کے ٹوٹنے کی کہانی، دردناک کہانی، لگتے ہیں۔ اس کے باوجود جب ہمیں کہیں روشنی کی کرن نظر آتی ہے تو ہم اسے اجالا سمجھ کر خوشیاں مناتے اور بگل بگل لگتے ہیں۔ حسین خوابوں میں کھوکھڑے مستقبل کے نقشے بناتے لگتے ہیں اور پھر ایسے میں کہیں سے اقتدار کے تقاضوں کی چٹان گرتی ہے اور ہمارے خوابوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ اسی طرح روشنی کی وہ کرن جس پر ہمیں اجالے کا گمان ہوتا تھا ہمیں طرح دے کر یوں غائب ہوتی ہے کہ ہم ایک بار پھر اندھیروں کے مسافر بن جاتے ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ یہ سلسلہ گزشتہ ساٹھ برس سے جاری ہے لیکن ہماری اصل بد قسمتی یہ ہے کہ یہ سلسلہ رکنے کا نام نہیں لیتا۔ اس کے خاتمے کے آگاہ کہیں نظر آتے۔ اس لئے اگر ان قومی خوابوں کے ٹوٹنے کی آہنگ با زلزلت تحریروں اور کالموں میں سنائی دینے لگے تو اس سے رنجیدہ خاطر نہ ہوں کہ:

مجاز ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہوں میں

مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ انقلاب، وہ بحر، جس کا ہمیں کئی دہائیوں سے انتظار تھا ایک بار پھر ہمیں بھلک دکھا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے اور اب نہ جانے وہ بحر کب طلوع ہو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہم آئیڈیلزم اور خوابوں کے مارے ہوئے لوگ سمجھتے تھے کہ جب جمہوری قوتیں آمریت کا تابوت اپنے کندھوں پر اٹھا کر آمریت کے قبرستان میں دفن دیں گی اور ملک میں جمہوریت کی روشنی پھیلے گی تو پاکستان میں پہلی بار آزاد اور مضبوط عدلیہ کا سورج طلوع ہوگا اور جب ملک میں آزاد عدلیہ کا قیام عمل میں آئے گا تو پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار قانون کی حکمرانی، رول آف لاء اور آئین کی بالادستی قائم ہوگی۔ انصاف کی ندیاں بہیں گی اور غلاموں کی آنکھیں دادرسی کے یقین سے جھلکا اٹھیں گی۔ پہلی بار ملک میں انتظامیہ کے گلے میں قانون کی بالادستی کا پھندا ڈالا جائے گا اور انسانی مساوات..... انسانی برابری..... کا خواب شرمندہ تعبیر ہوگا۔

یہی وہ خواب تھا جس کا واضح وعدہ اور نقشہ قائد اعظم کی تقاریر میں جا بجا ملتا ہے۔ اگر ہم قائد اعظم کے تصور پاکستان کو سمجھنے کی کوشش کریں تو احساس ہوتا ہے کہ آئین کی حکمرانی، قانون کی حکومت، انسانی برابری، معاشی اور سماجی انصاف قائد اعظم کے تصور پاکستان کے اہم ترین ستون تھے۔ میں قائد اعظم کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں اور میں جب بھی قائد اعظم کی تقاریر اور فرمودات کی انجمن میں جاتا ہوں تو مجھے یہ پتہ چلتا ہے کہ قائد اعظم کا تصور جمہوریت قانون و آئین کی حکمرانی سے منسلک تھا یعنی وہ اس طرز حکومت کو جمہوریت کہتے اور سمجھتے تھے جس میں سیاستدانوں اور حکمرانوں کی اغراض کی بجائے آئین و قانون کی حکومت ہو۔ جب آئین و قانون کی حکمرانی ہوگی تو لازمی طور پر قانون کی نظر میں ہر شخص، قطع نظر اپنے دنیاوی مقام و مرتبے کے، برابر ہوگا۔ انگلستان میں شاہی خاندان، حکمرانوں اور عوام کے لئے ایک ہی قانون اور جرم کی ایک ہی سزا ہے اور یہ جمہوریت کی دین ہے جبکہ ہمارے ذات پات اور اونچے نیچے کے شکار معاشرے میں بڑوں کے لئے اور قانون اور محروم طبقوں کے لئے اور قانون کا فرما ہے۔ ہم مسلمان ہونے کے باوجود اسلام کے روشن اصولوں سے روگردانی کے مرتکب ہو چکے ہیں جبکہ قائد اعظم اسلام کے انسانی مساوات اور معاشی و سماجی انصاف کے اصولوں کے گرویدہ تھے اور ان کا ذکر بار بار کرتے تھے وہ زندہ رہتے تو پاکستان پر انہی اصولوں اور قوانین کی حکمرانی ہوتی لیکن ان کی موت نے ہمارے اسب سے پہلا خواب توڑ دیا۔

سیاسی نظام اور ریاستی ڈھانچے کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ قانون و آئین کی حکمرانی کا تعلق جہاں مقننہ، سیاسی نظام اور ریاستی ڈھانچے سے ہوتا ہے وہاں اس پر عملدرآمد کی ذمہ داری عدلیہ پر ہوتی ہے کیونکہ عدلیہ ہی آئین و قانون کی حکمرانی کو یقینی بناتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ جب تک ملک میں عدلیہ مکمل طور پر آزاد اور مضبوط نہ ہو، محض جمہوری نظام اور آئین کی موجودگی سے قانون کی حکمرانی کا خواب حقیقت میں نہیں بدلا جاسکتا چونکہ قانون کی حکمرانی جمہوری نظام کی روح ہوتی ہے اس لئے قانون کی بالادستی کے بغیر جمہوری نظام بھی تشہہ اور نامکمل ہی رہتا ہے جس کا تجربہ ہم نے گزشتہ چھ دہائیوں میں کیا ہے بلکہ جسے ہم نے بحیثیت قوم ساٹھ برس تک بھگتا ہے۔ آمریت کے ساتھ ساتھ پاکستان میں جمہوری ادوار بھی آتے رہے، انتخابات بھی ہوتے رہے اور منتخب پارلیمان اور حکمران بھی آتے جاتے رہے لیکن قانون کی حکمرانی کا خواب تشہہ تکمیل رہا۔ محض ایک خواب ہی رہا کیونکہ عدلیہ انتظامیہ کی خواہشوں کے تابع رہی اور قانون کو حکمرانوں کے تقاضے پورے کرنے کے لئے وقتی ضرورتوں کے سانچے میں ڈھالتی رہی۔ نتیجہ یہ کہ ملک پر طویل عرصے تک نظریہ ضرورت چھایا رہا جو فوجی آمریتوں کی آمد کی راہ ہموار کرتا رہا۔ اگر 1955ء میں جسٹس منیر غلام محمد کے اقدام کا راستہ روک دیتے اور قانون و آئین کی بالادستی کا اصول سختی سے طے کر دیتے تو 1958ء میں سکندر مرزا مارشل لاء لگانے سے قبل ہزار بار سوچتے۔ مختصر یہ کہ گزشتہ ساٹھ برسوں سے ہماری اصل بد قسمتی کی جڑ عدلیہ کا حکمرانوں کے ہاتھ کی چھڑی اور کلائی کی گھڑی بن جانا تھا۔ اسی لئے عوام جمہوریت کے ثمرات سے بھی محروم رہے اور انہیں جمہوری نظام کی برکات کا اندازہ ہی نہ ہو سکا۔

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ عدلیہ میں ہاضمیر، آزاد اور مضبوط جج ہمیشہ رہے ہیں لیکن ہماری بد قسمتی کہ وہ ہمیشہ اقلیت میں تھے مثلاً جسٹس منیر کے نظریہ ضرورت سے جسٹس کارنیس نے اختلاف کیا تھا لیکن اکثریت اقلیت پر غالب آگئی۔ بھٹو کے عدالتی کیس سے لے کر براہم قومی موڑ پر یہی ہوتا رہا کہ ججوں کی اکثریت انتظامیہ کے تقاضوں کی تابع رہی اور اس طرح آئین و قانون پامال ہوتے رہے۔ ہمارے خواب ٹوٹتے رہے اور معاشرے میں محرومیاں جنم لیتی اور پروان چڑھتی رہیں۔ انہی محرومیوں نے پاکستانی قوم کو باطنی طور پر منقسم اور یکجانہ ہونے دیا۔ امریکی تاریخ میں ریاستوں کے درمیان

محرمیوں اور بے انصافیوں کے ازالے میں سب سے اہم رول عدلیہ کا ہے۔ اگر پاکستان میں بھی عدلیہ اپنا صحیح رول ادا کرتی تو صوبوں کے درمیان پھیلتی ہوئی منافرت کی جڑوں کو کاٹا جاسکتا تھا لیکن کیا سمجھتے کہ صوبائی قوتوں کو کبھی بھی عدلیہ سے انصاف کی توقع ہی نہیں رہی۔ اب ایک بار پھر ہمارا خواب ٹوٹا ہے اور امید اپنی روشنی کی کرن دکھا کر غائب ہو گئی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ ہماری قومی تاریخ کی ایک عظیم ٹریجڈی ہے۔ سانحہ ہے اور دھوکہ ہے۔ افتخار چودھری کی سربراہی میں ساتھ جتوں کی آمریت اور لاقانونیت سے بغاوت نے ہمیں ایک آزاد اور مضبوط عدلیہ کا خواب دکھایا تھا۔ ایک ایسی عدلیہ جو قانون و آئین کی حکمرانی کو یقینی بنائے گی اور نتیجے کے طور پر پاکستان میں انسانی مساوات اور انصاف کے چراغ جلیں گے۔

انہی چراغوں کی روشنی کو میں انقلاب کہتا اور لکھتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جب جمہوری نظام کی بحالی کے ساتھ ساتھ پاکستان میں پہلی دفعہ قانون کی حکمرانی کا دور شروع ہوگا تو ایک نیا پاکستان جنم لے گا لیکن افسوس! میرا وہ خواب ادھورا رہ گیا۔ وقت نے ہمیں پھر دھوکہ دے دیا اور انقلاب کو ناکام کر دیا۔ اگرچہ مجھے اب بھی وکلاء تحریک سے بے پناہ امیدیں ہیں اور عوام کے ذہنوں میں جو خواب پرورش پارہے ہیں وہ بھی ضرور رنگ لائیں گے لیکن وقتی طور پر ہمیں شدید دھچکا لگا ہے۔ ہمارے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں کیونکہ جس طرح صرف اور صرف پسندیدہ جتوں کو بحال کرنے کا عمل شروع ہوا ہے اور باغی اقلیت کو انکار کی سولی پر لٹکا دیا گیا ہے اس سے کبھی بھی آزاد اور مضبوط عدلیہ کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا اور جب عدلیہ آزاد اور مضبوط نہیں ہوگی، کیونکہ حکومت کے من پسند جتوں اور پی سی او جتوں پر مشتمل عدلیہ کبھی آزاد و مضبوط ہو نہیں سکتی، تو قانون و آئین کی حکمرانی کا خواب محض خواب ہی رہے گا۔ یہ قوم کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ اگر کل کلاں زرداری صاحب یا بیٹے بلاول کو عدالت میں جانا پڑا یا پھر کسی آمر نے شب خون مارا تو تاریخ اپنے آپ کو پھر دہرائے گی اور ہم ایک بار پھر اپنے قومی مقصد پر ماتم کناں ہوں گے کہ انقلاب آتے آتے رک گیا۔ صبح طلوع ہوتے ہوئے رات میں ڈھل گئی۔ پھر یہ بھی سانحہ ہے کہ سیاستدان اور حکمران اقتدار سے باہر کچھ اور ہوتے ہیں لیکن اقتدار کے ایوان میں قدم رکھتے ہی بدل جاتے ہیں اور اپنی اصلیت کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ عوام ہیں کہ بار بار دھوکہ کھاتے ہیں۔ خدا جانے ان کی آنکھیں کب کھلیں گی اور وہ اپنا مقدر بدلنے کا ارادہ کب کریں گے؟



Print This Post



Email This Post

Posted in [Columns](#), [Dr. Safdar Mehmood](#) [No Comments »](#)
Page 3 of 31 «12345678»...Last »